—— جو اُس کے سامنے صاف سیدھی اور عام فہم ہوتی، لوگوں کی عقل میں کیوں نہ آتی تھی۔ صرف یہی نہیں کہ لوگ اس سے انکار کرتے، بلکہ ایک بات جو صریحاً غلط ہوتی اُسے مانتے چلے جاتے، اُس کے جواز ایجاد کرتے۔ اس بات کا بھی اُس کو کبھی بعد میں پتا چلا کہ فہم کی عجیب عجیب شکلیں ہیں جو اپنی اپنی حاجتوں پہ قائم ہوتی ہیں، جن کا اپنا ایک اسرار ہوتا ہے جو فریب در فریب کام کرتا ہے۔ اور یہ بات اُس کو زندگی کی اور ساری باتوں میں سب سے زیادہ افسوسناک معلوم ہوئی کہ آدمی کا فہم نہر کے گدلے پانی کی طرح ہے۔ جس کے اندر جاؤ تو اندھیری رات ہوتی ہے، اور اندھا دھند چلتے، ہاتھ پاؤں سے ٹٹول کر اندازہ کرتے جاؤ کہ محض دم باندھنے کی مہم ہے، نہ کوئی حیرت نہ سُراغ، نہ دریافت نہ کوئی جستجو۔ اس زمانے میں بہرحال، لوگوں کے دو بدو ہو کر۔ ان سے اُلجھ اُلجھ کر، ان کے اختیار اور تحکّم کا راز، اور اس راز کا کھوکھلا پن اُس پہ عیاں ہوتا گیا۔

اس انوکھی اُٹھان کا یہ دَور بھی ایک جھلک دکھا کر، اپنے سبق سکھا کر گزر گیا۔ اُسی سال کے جاڑوں میں دَورے اس رفتار اور اتنی شدت سے آنے لگے کہ اُسے کالج چھوڑنا پڑا۔ چچا نے بے دریغ پیسے خرچ کیے، لاہور تک ڈاکٹروں کے پاس اُسے لے کر گئے، جواب ایک ہی: کہ اس بیماری کے اطوار انوکھے ہیں، یقینی طور پر صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ سانس کی بیماری کی ایک قسم ہے۔ اِس کا جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا ناممکن ہے۔ کبھی کوئی قسمت والا، عُمر کے ساتھ، قدرتی طور پہ اِس سے چھٹکارا پا جائے تو پا جائے، مگر کبھی کبھار۔ پھیپھڑے کی دیواروں پر جمنے والی رطوبت کی تھیلیوں کو خشک کرنے کے لیے ٹیکے ہیں، دوا کی گولیاں ہیں، سانس کے ساتھ اندر کھینچنے والے عرق کے کیپسول ہیں، جن کے استعمال سے مسلسل افاقے کی صُورت نکالی جا سکتی ہے۔ جسمانی تکلیف بہرحال سہارنی پڑے گی۔ آگے اپنی اپنی قسمت۔ مایوسی کی کوئی بات نہیں، نوجوانی میں اس کے کوئی ضرر رساں یا دیرپا اثرات نہیں ہوتے، صرف ذہنی حالت درست رکھنے کی ضرورت ہے، وغیرہ وغیرہ۔

یہ کچھ لوگ ہوں گے جو تکلیف کے عادی ہو جاتے ہیں۔ وہ نہ ہو سکا۔ دورہ جب ہوتا تو پانچ منٹ کیا اور کیا پانچ گھنٹے، جان حلق میں اٹک جاتی، دماغ ماؤف ہونے لگتا۔ جب گزر جاتا تو گردن سے لے کر کمر تک کی ہڈیاں درد سے چُور ہو جاتیں۔ جیسے بیلوں کی جگہ پر جُت کر دن بھر کنوئیں کے چکر نکالتا رہا ہو۔ نیند کی بے روک خواہش سارے بدن پہ چھا جاتی۔ حتّیٰ کہ عقیدہ ٹوٹ گیا، گو اُمید نہ ٹوٹی۔ ڈاکٹروں کے بعد حکیموں کی، پھر ٹونے ٹوٹکے اور تعویذ گنڈے والوں کی باری آئی۔ گرما کا ایک موسم بیت گیا۔ وہ کتابیں پڑھتا، کبھی کبھار کوئی معمولی سی نظم لکھنے کی کوشش کرتا، اور کھیتوں میں پھرتا رہتا۔ آخر ایک روز گُمشدہ حکیم کی خبر اُس کے کانوں تک پہنچی۔

خبر لانے والے نے کہا کہ حکیم کوئی ایسی مشہورِ زمانہ شخصیت نہ تھی، مگر آس پاس کے دس بیس گاؤں میں اُس کا بڑا

مشہور تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اُس کے پاس کچھ لاعلاج بیماریوں کے، جن میں سانس کی بیماری بھی تھی، چند نسخے تھے جو آزمودہ تھے۔ کہیں نہ کہیں اس کا علاج بھی کر کے دیکھ لیا جاتا ہے، کہتے ہیں غرض مند اندھا ہوتا ہے۔ چنانچہ اگلی گرمیوں کے موسم میں اسد نے رختِ سفر باندھا اور گھر سے چل پڑا۔

گاڑی سے وہ راولپنڈی پہنچا۔ وہاں سے بس لے کر آزاد کشمیر کو روانہ ہوا۔ کئی گھنٹے کے سفر کے بعد ایک جگہ پر بس چھوڑ کر خچر کے ذریعے دریا کے ساتھ ساتھ پہاڑی راستے پر چل دیا۔ بیس پچیس میل کا راستہ اوپر ہی اوپر کو چلا جاتا تھا۔ جوں جوں وہ اونچائی پہ چڑھتا گیا ہوا میں ٹھنڈک آتی گئی۔ کچھ چڑھائی کا سفر، کچھ ہوا کی لطافت، سینے پہ کام بھاری آ پڑا۔ ہر میل دو میل پر رک کر وہ ایک کیپسول کو پین ہیلر میں بھرتا، پھر پین ہیلر کو منہ کے اندر ڈال کر کیپسول کو توڑتا، اور دوا سے ترطِل کے راستے سانس اندر کی طرف کھینچتا۔ اس طرح دم بھرتا ہوا وہ آگے بڑھتا رہا۔ اس بلندی پہ پہنچ کر خنکی اتنی بڑھ گئی تھی کہ اسے سویٹر نکال کر پہننی پڑی۔ یہاں پر چیڑ کے جنگل گہرے ہونے شروع ہو گئے تھے۔ سامنے والے پہاڑ پر سے دیودار کے کاٹے چھانٹے ہوئے تنے سینکڑوں کی تعداد میں لڑھکائے جا رہے تھے۔ ہزاروں فٹ کی بلندی سے لڑھکتے ہوئے یہ بےبس تنے تنکوں کی مانند نیچے دریا میں گرتے اور پانی کے بہاؤ پر ڈوبتے، ابھرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوتے۔ اسد کچھ دیر تک رک کر اس منظر کو دیکھتا رہا۔ کبھی کبھار کوئی فوجی جیپ اس راستے پر سے گزر جاتی۔ چند میل پر اسے جیپ کا راستہ بھی چھوڑنا پڑا۔ اب وہ ایک تنگ سے پتھریلے راستے پر جا رہا تھا جو پہاڑ کے پہلو میں چکر کھاتا ہوا اوپر چڑھتا تھا۔ وہ ایک آدھ کوس ہی گیا ہوگا کہ شام پڑ گئی۔ اسد اور اس کا خچر مزدور محکمہ جنگلات کے ڈاک بنگلے میں پہنچے جہاں سے گاؤں بنام گمشدہ ابھی مزید سات آٹھ سو فٹ کی بلندی پہ تھا۔ یہاں پر شاہ رُخ نے اسد کو رات بسر کرنے کی دعوت دی جو اس نے بخوشی قبول کر لی۔ وہیں سے اس نے اپنے رہبر کو مزدوری دے کر رخصت کیا جو اپنے خچر کو لے کر واپس شہر کو ہو لیا۔ یہ شاہ رُخ سے اس کی پہلی ملاقات تھی۔ وہ رات گئے تک میٹھے باتیں کرتے رہے۔ شاہ رُخ اس کو جنگلات کی زندگی کے پرلطف واقعے، اور اس گاؤں کے انوکھے نام کی تاریخی وجوہات کے قصے سناتا رہا۔ حکیم کے بارے میں شاہ رُخ نے صرف اتنا کہا: "جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر یہ اپنی اپنی حاجتوں کا معاملہ ہے، کیا معلوم کہاں سے پوری ہو جائیں۔ تم خود ہی آزما کر معلوم کر لینا۔"

حکیم چھدری سفید داڑھی والا دبلا پتلا آدمی تھا۔ اسے چچا کا خط مل چکا تھا، نہایت خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ مطب کے عقب میں، مریضوں کے ٹھہرنے کے واسطے مخصوص تین کمروں میں سے ایک اسد کو دے دیا گیا۔ وہاں پر اپنا سوٹ کیس اور بستر رکھ کر وہ مطب میں آن بیٹھا۔ اُس کے کھانے کا انتظام، حکیم نے بتایا، حکیم کے ایک مزارعے کے گھر سے ہوگا۔ اسد نے جھجکتے ہوئے معاوضے کے بارے میں پوچھا۔ معاوضہ نام کی یہاں کوئی چیز وصول نہیں کی جاتی۔ حکیم نے عجیب نرمی اور

سختی کے ملے جُلے انداز میں جواب دیا۔ یہ تکلیف رفع کرنے کا مقام ہے۔ یہاں سب کچھ اللہ اور انسانیت کے نام پر کیا جاتا ہے۔

اگلی صبح، فجر کے وقت نہار منہ حکیم نے اپنے دونوں ہاتھوں سے، باری باری آنکھیں میچ کر اُس کی دونوں کلائیوں کی نبضیں دیکھیں۔ آنکھوں کی پتلیوں کا غور سے معائنہ کیا، سینے کے ساتھ کان لگا کر سانس کی آواز کو سُنا۔ اِس میں کوئی دس منٹ لگ گئے۔ پھر حکیم نے اپنی الماری کھول کر بیچ والے خانے سے ایک کھلے منہ والی پھکنی سی بوتل نکالی اور اُس میں سے، احتیاط کے ساتھ، اٹھارہ گولیاں گنیں، اُن کی چھ علیحدہ علیحدہ پڑیاں —— چھ دن کے واسطے۔ بنائیں اور اُس کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ ایک گولی صبح، ایک دوپہر، ایک شام، پانی کے گلاس کے ساتھ، حکیم نے کہا۔ ساتویں دن اسی وقت پھر نبض دیکھی جائے گی اور اگلے علاج کا تعین ہوگا۔

ان گولیوں نے جادو کا اثر دکھایا۔ پہلے روز سے ہی اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُس کی سانس ہلکی اور ہموار ہوتی جا رہی ہے۔ سینے کی سرنگ جیسے جگمگا اُٹھی۔ یہ وقت سال کے سخت موسموں میں سے تھا۔ ان دنوں ہفتہ وار دورہ اُٹھتا تھا۔ ان گولیوں کے اثر سے ہفتہ بھر سانس بھاری نہ ہوئی، اور نہ پھر اگلے ہفتے اور نہ اس سے اگلے۔ ساتویں دن نہار منہ پھر حکیم نے نبض دیکھی اور اطمینان سے سر ہلا کر اُسے رخصت کیا۔ وہ کم سے کم دوا دینے کا قائل تھا، اُس نے کہا، اگر کم دوا سے کام نکلتا ہے تو کم دو، الو، باقی پرہیز اور احتیاط۔ یہ اُس کا اصول تھا۔ اہم بات تو یہ ہے کہ مریض اپنے ذہن کو پریشانی سے دُور رکھے۔ اسد نے حکیم کی ہر بات پہ لبیک کہنا شروع کیا۔ اُس کا دل خوش و خرم تھا۔ نہ جانے کتنے ہی سینکڑوں دن اور رات کن کن عجیب غریب بدمزہ دواؤں سے، ٹیکوں سے، اُس نے اپنے نوجوان جسم کو بدامن کیا تھا، کیسے کیسے دواخانوں کی ڈیوڑھیوں میں انتظار کاٹا، لاتعلق آنکھوں والے چہروں سے مشورے کیے اور کاغذ کی پرچیاں —— اپنی بے اطمینانی کے پُرزے —— اُٹھائے دل میں کرشموں کی اُمید لیے باہر آیا تھا۔ اور اب —— بھورے رنگ کی ننھی ننھی کل اٹھارہ عدد گولیوں نے اُسے اُس دُنیا سے اُٹھا کر یہاں پہ لا کھڑا کیا تھا جہاں زمین کا اور آسمان کا رنگ بدل چکا تھا۔ نا اُمید ہوتے ہوئے شخص کی سی پُراُمیدی سے اُس نے سوچنا شروع کر دیا کہ اب بیماری دُور ہو چکی۔ اپنے اندر اُس نے ایک ایسی سرمستی کی لہر محسوس کی جو صرف اُن لوگوں کا حصّہ ہوتی ہے جنہوں نے کسی لاعلاج بیماری کی شکل دیکھی ہو۔ پیڑ، پرندے، پتھر اور پہاڑ، ہوا اور آوازیں، چیزوں کی ترتیب اور ترکیب، گاڑیاں اور فوجی، دھوپ چھاؤں، ہر شے صاف اور شفاف، آنکھوں کے بہت قریب اور ساتھ ہی بہت دُور مگر نمایاں، دھلی ہوئی جیسے کہ وہ کسی دوربین میں سیدھی اور اُلٹی طرف سے ایک ساتھ دیکھ رہا ہو اور نظر میں کوئی آڑ نہ ہو۔ آویزش در آویزش اور انفراد در انفراد ایک سہ پہر کے عرصے میں اُس نے ایک نظم لکھی، ایک خط لکھا۔ صبح اور شام کے وقت وہ جنگل میں لمبی

سیر کو جاتا، اور اپنے بدن کو ابھی تک، ہمیشہ کی طرح قوی اور چست پا کر حیران ہوتا۔ مطب میں درسوں کو وہ چلتے پھرتے، دوائیاں پیتے، حکیم کے گھر باہر کا کام کرتے، اُس کی گائے کو گھاس ڈالتے ہوئے دیکھتا تو اُس کے دل میں اُن کے لیے محبت کے جذبات پیدا ہوتے۔ کیا سیدھے سادے مخلص لوگ تھے جو یہاں سے علاج حاصل کر رہے تھے اور اپنے اپنے طور اس کی قیمت چکا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ولی نے اُس سے کھل کے بات کرنا شروع کی۔ پھر میر حسن نے۔ ولی نے سب سے پہلے اُسے اُن بڑے بڑے شہروں کے نام بتائے جو وہ اپنی فوجی ملازمت کے دوران دیکھ چکا تھا۔ یہ بتا چکنے کے بعد وہ اسد سے بے تکلفی سے باتیں کرنے لگا۔ میر حسن، گاؤں کے لوہار کا سترہ سالہ بیٹا، تپ دق کا مریض، ہلکے ہلکے بخار سے مستقل چمکتی ہوئی آنکھوں اور باریک ناک نقشے والا، چڑیا کے بچے کی مانند پھرتیلا اور ذہین تھا۔

"تم جو ڈھونڈ رہے ہو یہاں نہیں ہے۔" ایک روز اچانک میر حسن نے اپنے جھٹکے دار لہجے میں اُس سے کہا۔ اس روز پہلی بار اُس نے براہِ راست اسد سے بات کی تھی۔ میر حسن کا مخصوص، سر اور کندھوں اور ہاتھوں کو جھٹک جھٹک کر باتیں کرنے کا انداز تھا، جیسے مسلسل اَن دیکھے دھماکوں سے چونک چونک پڑ رہا ہو۔ اُس کا یہ انداز نو وارد کو اکثر مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ اسد اُس کی بات پر حیران رہ گیا۔ "کیا نہیں ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"علاج۔" میر حسن نے کہا۔

"اور کہاں ہے؟"

"کیا معلوم۔" میر حسن بولا۔ "مگر یہاں نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے؟" اُس نے سوال کیا۔

"ہماری طرف نہیں دیکھتے؟ سالوں سال سے یہاں کام کر رہے ہیں۔ یہاں کوئی تندرست نہیں ہوتا۔"

"کیوں؟"

"بس۔" میر حسن نے سرکشی اور مایوسی کے ملے جلے لہجے میں سر کو جھٹکا دیا۔ "ایک کنواں ہے۔ پانی پینے کے لیے اس میں اُترو تو اندر ہی رہو۔"

اسد آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتا رہا۔ ولی نے میر حسن کو بکواس بند کرنے کو کہا۔ وہ چپ ہو گیا۔ احمد کا سانپ کا سا بے لب دہانہ ایک خوفناک سی مسکراہٹ میں چہرے کی ہڈیوں پر پھیل گیا۔ ایک بے وجہ سا غصہ اسد کے دل میں پیدا ہونا شروع ہوا۔ وہ مطب کی دیوار کے پاس جا کھڑا ہوا اور نیچے دیکھنے لگا۔ ایسا شفاف دن تھا کہ نظر دور تک جاتی تھی۔ میلوں دور، تین پہاڑوں کے درمیان کچی سڑک کا چند گز کا ٹکڑا ایک دھاگے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ اس پر تین فوجی گاڑیاں یکے بعد دیگرے گزر گئیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر اُن سب کے چہرے ایک ایک کر کے اُس کی آنکھوں کے سامنے

گزُر گئے۔ یاخدایا، اُس نے اپنے آپ سے کہا، یہ ماجرا کیا ہے۔ کوئی بھی تو بات نہیں کی۔

چار ہفتوں کے گزرنے پر سانس کا ہَوکا لوٹ کر آیا۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹا، چھت کی طرف دیکھتا ہوا کسی بات کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک اُس نے اسے آتے ہوئے دیکھا اور خوف، گدلے سے گھنے دھوئیں کی مانند اُس کے دل کو چڑھنے لگا۔ چند لمحوں کے لیے اُس کے پٹھے کھِچ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دھواں سانس میں بدل گیا اور اُس کے سینے پر جا بیٹھا۔ آہستہ آہستہ، کوشش کر کے اُس نے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑا اور چارپائی پر سر نہوڑا کر بیٹھ گیا ــــ ان چار ہفتوں میں اُس نے بمشکل، بڑی محنت اور محبت کے ساتھ، اپنے آپ کو ایک ایسی بات پر اعتبار کر لینے پہ راضی کیا تھا جو وہ اپنے شعور سے پرے کہیں جانتا تھا کہ ناقابلِ یقین ہے ــــ وہی رنگ، وہی روپ۔ ہلکا نیلا اور بھُورا، جس میں پیلاہٹ کے چھینٹے تھے۔ یہ ریلا پچھلے چار ہفتوں کی مجموعی شدت کے ساتھ آیا اور گزر گیا۔ جیسے ہی سانس برابر ہوئی وہ حکیم کے پاس پہنچا۔

"میں تو سمجھا تھا،" وہ جھجکتے ہوئے بولا، "اب اس سے چھٹکارا ہوا۔"

"چھٹکارا ہوگا۔ ضرور ہوگا۔" حکیم نے مہربانی سے مسکرا کر جواب دیا۔ "مگر چٹکی بجانے میں نہیں۔ دوا نے اثر دکھایا ہے، دورہ زیادہ دیر نہیں رہا۔"

"مگر بہت شدید تھا۔" اسد نے کہا۔

"اس وقت یہی کافی ہے کہ دوا نے اثر تو دکھایا۔ اب ہم علاج کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔ اور دورہ شدید بھی نہیں تھا۔ چونکہ کافی وقفے کے بعد آیا ہے اس لیے تمہیں شدید لگا۔"

"بہت شدید تھا۔" اسد نے دہرا کر کہا۔

حکیم نے بے خیالی سے سر ہلایا۔ "جسم کو ڈھیلا چھوڑو، کمر سیدھی کر کے بیٹھو، نکل جائے گا۔ یہ لو۔" حکیم نے پہلے کی سی، تین تین گولیوں والی چھ پُڑیاں اُس کے ہاتھ میں پکڑائیں (اب کے اُس نے پُڑیاں پہلے سے بنا کر الماری میں رکھی ہوئی تھیں)، "موذی مرض ہے، بیٹا، وقت لے گا، مگر رفع ہو جائے گا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔"

وہ اپنے کمرے میں آ کر چارپائی پر لیٹ گیا، اور گزشتہ چار ہفتوں کے دمکتے ہوئے وقت کو یاد کرنے لگا۔

اُن گولیوں نے پھر ویسا اثر نہ دکھایا۔ وہ رنگ میں، حجم اور بناوٹ میں، ذائقے تک میں بالکل ویسی ہی تھیں جیسی کہ پہلی، اور وہ اُن کو اسی طرح دن میں تین بار پانی کے گلاس کے ساتھ کھاتا رہا، مگر دورہ تین ہی ہفتے کے بعد وارد ہو گیا۔ اِس بار وہ نیم متوقع حالت میں تھا، چنانچہ خوفزدہ نہ ہوا۔ اُس نے دیوار کے ساتھ سیدھا اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی، مگر بیٹھ نہ سکا۔ اِس بار اس میں اتنی شدت نہ تھی، مگر پہلے سے کچھ زیادہ دیر تک رہا۔ پھر بھی اٹھارہ گولیاں اُس کو

کھانے کو میں جو اس نے بے یقینی سے، چھ روز میں نگلیں۔ جب تین ہی ہفتے کے بعد تیسرا دورہ ہوا تو وہ حکیم کے پاس جا کر پھٹ پڑا :

"اب ان گولیوں میں اثر کیوں نہیں رہا؟"

"اثر تو ہے۔" حکیم نے سرد آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

"کہاں ہے؟ ایک ہفتے سے زیادہ کی گولیاں میں کیوں نہیں کھا سکتا؟"

"دوا کی بڑی سے بڑی خوراک ایک وقت میں یہی ہے۔"

"پہلی بار کیسے فائدہ ہوا تھا؟"

"یہ دوا اسی طرح اثر کرتی ہے، بچے۔ آہستہ آہستہ۔"

"کہاں اثر کرتی ہے؟ پہلی بار کے بعد کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

"میرے خیال میں تمہیں کافی آرام آگیا ہے۔"

"ہونہہ! آرام۔ کیسا آرام؟"

"دوروں سے، نوجوان، اپنے دوروں سے آرام۔ یاد ہے جب تم آئے تھے تو کس حالت میں تھے؟ چھ سات دن میں دورہ ہو رہا تھا، اور تیز اتنا کہ بات نہیں نکلتی تھی، اور بارہ بارہ گھنٹے تک بونکتے تھے۔ یاد ہے؟ اور اب؟ کتنے کتنے وقفے پر آتے ہیں اور کتنی دیر رہتے ہیں؟ یہ آرام نہیں تو اور کیا ہے؟ بتاؤ، یہ آرام نہیں تو اور کیا ہے؟ تھ تھ تھ۔" حکیم نے مایوسی سے سر ہلایا، "لوگوں کی مصیبت تو یہی ہے، بھول جاتے ہیں، اپنی تکلیف کو بھی بھول جاتے ہیں، حیرت کی بات ہے۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ اپنی تکلیف کو بھول جانا دنیا کی سب سے آسان بات ہے، چاہے تکلیف کیسی ہی سخت کیوں نہ ہو۔ میں پچیس سال سے علاج کر رہا ہوں، مجھ سے زیادہ اس بات کو کون جانتا ہے۔ آرام کی خاطر یہاں آتے ہیں، سب چیزوں کو چھوڑ کر صرف آرام حاصل کرنے کی خاطر، اور آرام حاصل کرتے ہیں۔ مگر پھر؟ کیا وہ ایک منٹ کے لیے کبھی بیٹھ کر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں؟ نہیں، نہیں جناب، سب بھول جاتے ہیں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ ہماری بیماری رفع کرو، ہمیں جلد از جلد فارغ کرو۔ اب وہ اپنا حق مانگتے ہیں۔ یہ میں نہیں کر سکتا۔ میں کوئی جادوگر ہوں؟ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ تھ تھ تھ۔" اس نے دوبارہ سر ہلایا، "آدمی کتنا حریص ہے۔ بیماری کی حالت میں بھی آدمی اتنا حریص ہے۔"

"مگر پہلی بار،" ممّا سد نے زور دے کر پوچھا، "چار ہفتے تک کیوں نہیں ہوا؟"

"بیماری رفع نہیں ہوتی، قابو میں آگئی ہے، سنو،" حکیم نے ہاتھ اٹھا کر اچانک دھیمے دھیمے میٹھے لہجے

میں بولنا شروع کیا، " تم چونکہ سمجھدار ہو، میں تمہیں تفصیل سے بتاتا ہوں۔ میری بات کو غور سے سنو، علم کی بات ہے، کام آئے گی۔ اس مرض کو ضیق النفس کہتے ہیں، قصبۃ الریہ اور تنفس کے عضلات میں شدید کھچاؤ کے باعث عارض ہوتا ہے جس سے سانس کے تواتر میں فرق آجاتا ہے۔ اس کے تین بڑی وجوہ ہیں۔ مگر یہاں ایک مشکل آن پڑتی ہے۔ تمہارا عارضہ عام فہم ضیق النفس کے عوامل پر پورا نہیں اترتا۔ اس کی صحیح تشخیص میں از حد احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ اسباب کو علامات پر مقدم رکھنا ہوگا اور شافی تدابیر شروع کرنے سے پہلے متعدد کوائف پر گہری نظر پڑے گی، مثلاً مریض کا مزاج، خاندانی وراثتیں، وغیرہ وغیرہ۔ محض سانس کی تیزی کا نام عارضۂ ضیق النفس نہیں۔ بعض دفعہ اس کے اسباب بہت ہی مختلف النوع ہوتے ہیں، مثلاً التہاب شعبی جس میں سانس کی نالیوں میں شدید سوزش ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی سانس کی نالیاں پھیل جاتی ہیں اور پھیپھڑے کے جوف میں بلغم بھر جاتا ہے اور حرارت غریبہ کی وجہ سے اس میں عفونت پیدا ہو جاتی ہے۔ گردوں کی کارکردگی کا بھی اس کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ گردوں کی چھلنی میں کسی غیر طبعی کیفیت کے باعث پیشاب میں خارج ہونے والے رسوب اور سمی مادے اس میں جمع ہو کر خون میں شامل ہو جاتے ہیں جس سے غشائے ریہ یعنی پھیپھڑوں کے غلاف یا حجاب حاجز میں ورم پایا جاتا ہے جس سے دل کی ملحقہ کراڑوں میں دوران خون کے ساتھ پیشاب کے سمی اجزاء اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی طرح کے متعدد اور اسباب ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اس کی تدابیر میں عجلت سے کام نہیں لیا جا سکتا بلکہ اس کا نادیر حصولی علاج ہونا چاہیے۔ دورے کی صورت میں صرف علامات کا فوری طور پر علاج ہوتا ہے، جب دورہ ختم ہو جائے تو پھر مستقل اصولی علاج کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اگر تم مجھ سے دو لفظوں میں اس کا علاج پوچھتے ہو تو وہ یہ ہے، تحمل اور بردباری۔ ادویات کے اثرات کا اندازہ اور نتیجے کا انتظار لاحاصل ہے۔ مسلسل علاج کرتے چلے جاؤ۔ تم تکلیف میں تھے، تمہیں آرام کی ضرورت تھی، آرام تمہیں بڑی حد تک مل گیا ہے۔ میرے واسطے یہی نصف سے زیادہ علاج کے برابر ہے۔ اب آگے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ لو۔"

اسد چھوٹی سی آواز میں کھنکارا اور اٹھارہ گولیاں لے کر واپس چلا آیا۔ اگلے دورے کے بعد اس نے ایک بار اور قسمت آزمائی کی:

" مجھے اگر،" اس نے احتیاط سے بات شروع کی، " دو ہفتے کی گولیاں ایک ساتھ مل جائیں تو شاید ——"

" ایسا میں نہیں کر سکتا۔"

" کیوں؟"

" میں اپنی دوا کو جانتا ہوں، تم۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ تمہیں فائدہ نہیں پہنچ رہا تو تمہیں حق ہے جب

چاہے علاج ختم کردو۔"

اس کے بعد وہ حکیم کے پاس نہ گیا۔ اب باقاعدگی سے ڈھائی، تین ہفتے کے بعد کبھی ہلکا کبھی تیز دورہ ہوتا، اور ہر دورے کے بعد چھ روز کی گولیاں کھانے کو ملتیں۔ بیشتر وہ اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ جنگل میں کچھ دور تک گھوم گھام کر واپس آجاتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ، کچھ کچھ بات اس کی سمجھ میں کبھی آتی، کبھی نکل جاتی۔ یہ ایک جگہ تھی جہاں پہ اس نے مکمل شفا کی دھندلی سی شکل ابھرتی ہوئی دیکھی تھی۔ آخر یہ جگہ بھی اسے محض افاقہ مہیا کرکے رہ گئی تھی۔ نصف سے زیادہ علاج، حکیم نے کہا تھا۔ کہیں مسلسل افاقے کی صورت ہی علاج کا نام تو نہیں؟ وہ سوچتا۔ اب تک تو وہ صرف انسانی چیزوں کی ماہیت جاننے پہ ہی اکتفا کرتا رہا تھا۔ اب اس زمانے میں پہلی بار اس نے ان کے بنیادی عمل دخل کے بارے میں سوال کرنا شروع کیے۔ لوگوں کی بے سمجھی تو سیدھی سادی (تسکین بخش) بات تھی۔ مگر جب ان چیزوں کے برتنے، اور ان کے اوپر زندگی بسر کرنے کا عمل شبہے کی زد میں آنے لگا تو بات وہاں پہنچتی تھی جہاں پہ اپنی ہی سمجھ کی بنیادوں کو ٹھوکر لگتی تھی، چنانچہ اس سطح پر سوچنے کی اس کو کبھی ہمت ہی نہ ہوئی تھی۔ شہر میں شہر وہ اپنی سانس کے علاج کے واسطے گھوما تھا، مگر اب اس عجیب غریب گاؤں میں پہنچ کر اس سوال کے بالمقابل آن کھڑا ہوا تھا، جیسے پہاڑ کی ایک وسیع و عریض عمودی دیوار ہو جسے پار کرنے کا کوئی راستہ دکھائی نہ دے۔ چند دن پہلے میر حسن اس کے پیچھے پیچھے جنگل کی طرف آنکلا تھا، جہاں تازہ گری ہوئی پتلی پتلی برف پہ بھیڑ بکریوں کے کھروں کے نشانات کے اوپر اوپر وہ گھومتے رہے تھے۔

"مجھے یہ سمجھ نہیں آتی،" اسد نے کچھ اپنے آپ سے، کچھ میر حسن سے سوال کیا، "کہ یہ سارا کھیڑا اس نے کیوں پال رکھا ہے۔ فرض کرو کہ دوسرے حکیموں کی طرح یہ ہم سے دوائی کی قیمت وصول کرتا ہے۔ تو اس کے پاس تو پیسے ہی اتنے ہو جائیں گے کہ کام کاج کے لیے کئی نوکر رکھ سکتا ہے۔"

"کام کاج!" میر حسن ہنسا، "اسے نوکر غلام چاہئیں، جن کے گلے میں رسا ڈال کر مطلب میں باندھ رکھے۔ نوکر تو آزاد لوگ ہوتے ہیں۔"

"اس کی زمینیں اور مکان وغیرہ کہاں سے آئے؟"

"پیسے والا ہے۔ گشند میں آتے ہی اس نے زمین خریدی تھی، پھر مکان بنوایا۔ پہلے کھیتی باڑی کرتا رہا، پھر دوا دینی شروع کردی۔ ایک دفعہ ایک مسافر ادھر سے گزرا تھا، اس نے یہاں بات کی کہ وہ اس کو جانتا ہے، جب یہ نیچے میدانوں میں ہوا کرتا تھا۔ اس کی عورت کسی کے ساتھ بھاگ گئی تو یہ اوپر چلا آیا۔ مگر یہ کا پتا کسی کو نہیں چلا کہ یہ کہاں سے آیا ہے۔ بیرے نانے نے یہ بات بتائی تھی۔"

"تمہارا خیال ہے اس واسطے یہ ایسا کرتا ہے ؟"

"کیا معلوم ۔" میر حسن نے کہا ، "آدمی کا کیا پتا چلتا ہے ۔"

اسد نے چہرہ ہوا میں اُٹھا کر لمبی سانس لی ۔ "برف میں چیڑ کی خوشبو کیسے بدل جاتی ہے !"

"ہاں ۔" میر حسن بولا ، "مَیں نے تم سے کہا تھا ، ابھی وقت ہے ، یہاں سے نکل جاؤ ۔"

"مَیں اس کا آخیر معلوم کر کے جاؤں گا ۔ اِس کا کوئی نہ کوئی مقصد تو ہو گا ۔"

"تمہیں کیا فائدہ ہو گا ؟"

"میری گولیاں ہی ہو ۔ بالکل وہی ہیں ۔"

"لگتی وہی ہیں ، مگر ہیں کہاں ؟ اصل چیز تو صرف پہلی بار ہوتی ہے ۔ اس کے بعد شکل وہی رہتی ہے ، اصل بدل جاتا ہے ۔ اصل وہ صرف پہلی بار ہی دیتا ہے ، یا بیچ میں گھٹا بڑھا کر دیتا رہتا ہے ۔ اس طرح یہ لوگوں کو باندھ کر رکھتا ہے ۔ تم نے دیکھا ہے کسی کو اپنی دوائی پینے کو نہیں دیتا ۔ کوئی اپنی دوائی نہیں پیتا ۔"

"پھر کون پیتا ہے ؟"

"بس ایک دُوسرے کی دوائیاں بناتے ہیں ۔ پتا نہیں ہوتا کہ کون کس کی بنا رہا ہے ۔ ملاوٹ گھر کے اندر جا کر کرتا ہے ۔"

"افاقہ تو ہوتا ہی ہے ۔" اسد نے کہا ۔

"ہنہہ !" میر حسن حقارت سے بولا ۔ "پہلے پہل افاقہ ہی معلوم ہوتا ہے ۔"

شام کی پھڑپھڑاتی ہوئی برفانی ہوا میں ، کمبلوں کو سر اور شانوں کے گرد کس کر لپیٹے ہوئے وہ دونوں واپس لوٹ گئے ۔

"ہو سکتا ہے ،" واپسی پر اسد نے بے خیالی سے کہا ، "اس کے پاس افاقے کا گُر ہی ہو ، اور کچھ بھی نہ ہو ۔"

میر حسن جواب دینے کی بجائے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا ، جیسے اُس کو اس بات کی سمجھ نہ ہو کہ افاقے کا گُر بھی کوئی گُر ہوتا ہے ۔ اسد کو احساس ہوا کہ گو لڑکے کو اس بات کا فہم نہیں ، مگر اُس کا قدیم روگ والا گُزشتہ پرست کسی نہ کسی طور حکیم کے اطوار کا بہتر علم رکھتا ہے ۔ یہ علم خود اُس کے بدن کو آہستہ آہستہ اب ہونا شروع ہوا تھا ۔ جیسے ہی دوروں کا وقفہ بڑھا ، انتظار کی کوفت ناقابلِ برداشت ہوتی گئی ۔ ایک کے گزرنے کے بعد وہ دُوسرے کی آمد کا منتظر رہتا ۔ دن گنتے گنتے آخر صُورتِ حال یہ ہُوئی کہ کئی بار اُس نے عمداً اِس وقفے کو کم کرنے کی کوشش بھی کی ۔ ایک بار اُس نے ہفتہ بھر کی گولیاں نہ کھائیں ، پھر اگلی بار سات دن کی مزید گولیاں لے کر دو ہفتے تک متواتر کھاتا رہا ——

صورت وہی رہی) اس اُمید میں کہ ایک بار اور گزر جائے، ایک بار اور چھٹکارا ہو، اِس پاگل اُمید میں کہ آخر ایک روز یہ آگ ختم ہو جائے گی یا اس کا زور ٹوٹ جائے گا یا کچھ نہ کچھ اور ہو گا، کوئی تبدیلی، کوئی زیر، کوئی زبر، کوئی آخرت۔

آخر جنوری کے پہلے ہفتے میں اس نے اپنا بستر باندھا اور کسی سے کچھ کہے بغیر گاؤں چھوڑ کر چل دیا۔ اپنے گاؤں جانے کی بجائے اُس نے کالج کا رُخ کیا اور ریاض کے پاس ہوسٹل میں جا کر ٹھہرا۔ اس سال ریاض کالج یونین کا سیکرٹری منتخب ہو چکا تھا۔ دن دن بھر وہ کالج میں پھرتے اور گزرے ہوئے الیکشن کے ہنگاموں کی باتیں یاد کرتے اور دوستوں سے گپیں لگاتے۔ صبح کے وقت وہ عموماً لائبریری میں چلا جاتا۔

"تمہاری صحت تو اچھی ہو گئی ہے۔" ایک روز ریاض نے کہا۔

"ہاں۔" اسد نے جواب دیا، "کافی افاقہ ہے۔ وہاں کی آب و ہوا بھی موافق آ گئی ہے۔"

"اب آ کیوں نہیں جاتے۔"

"آ تو گیا ہوں۔" اسد ہنسا۔

"داخلہ لے رہے ہو؟"

"ابھی کچھ روز دیکھتا ہوں۔"

"اچھے خاصے ہٹے کٹے ہو۔" ریاض نے کہا۔

"یہی اِس کی ایک خوبی ہے۔ تندرستی کم و بیش بحال رہتی ہے۔ یہ بھی نہ ہو تو خدا جانے کیا ہے۔"

اسی دوران میں، پچھلی مدت ختم ہونے پر، ایک دورہ وقتِ مقررہ پر ہو چکا تھا۔ اُس سے اگلے ہی ہفتے ایک اور ریلا آیا، اس قدر شدت سے کہ وہ رات بھر دل کو پکڑ کر ہونکتا رہا۔ جب گزر گیا تو دس گھنٹے تک سوتا رہا۔ اگلی صبح کر اُس نے ریاض سے کچھ پیسے اُدھار لیے اور گاڑی پکڑ کر واپس گشد کو روانہ ہوا۔

ان بیس دنوں میں گشد وہ گشد نہ رہا تھا۔ سب سے پہلے شیر کی موجودگی کی خبر اُسے شاہ رُخ سے ملی۔ دفعتہً اُس کے دماغ کے ہزاروں چھوٹے چھوٹے نیم تاریک گوشے روشن ہونے لگے ــ جیسے لیمپ کی بتی کو بہت آہستہ آہستہ کوئی اونچا کرے ـــــ جہاں اُس کی شبیہہ گویا ہمیشہ سے نیم تیار، نیم منتظر حالت میں کھڑی تھی۔ اب وہ اپنا لمبا اور سڈول دھاری دار جسم اور جلتی ہوئی آنکھیں لیے ہر طرف جگمگانے لگی۔ اُسی لمحے اُس نے ایک عجیب (بعید از قیاس) فیصلہ کیا، کہ یہ جانور اُس کا ہے، کہ اِس پہ ہاتھ ڈالنے کا اختیار کسی اور کو نہیں۔ اُسی شام ایک اور واقعہ ہوا؛ جس وقت تک اُس نے اِس جانور کے بولنے کی آواز نہ سُنی تھی، اُس کے تئیں یہ جانور ہی رہا تھا۔ مگر ایک بار، رات میں اُس کی چونکا دینے والی گرج سُن لینے کے بعد اُس عکس میں جس میں شکل اور شباہت تو تھی، چال ڈھال کے گمان بھی تھے، مگر سانس اور سانس کی آواز نہ چلتی

تھی، اُس میں جان پڑگئی۔ اس کے بعد اسد کے لیے ہمیشہ کے واسطے محض ایک جانور کی صورت میں اُس شکل کا خیال کرنا ممکن نہ رہا۔

حکیم نے اسد کی بیس روزہ غیر حاضری اور پھر اُس کی واپسی کو ایسے لیا جیسے کچھ ہُوا ہی نہ ہو۔ اُس نے شفقت بھرے لہجے میں اُس کا حال پُوچھا، اور اٹھارہ گولیوں کی چھ پُڑیاں فوری استعمال کے لیے دیں۔ دو دن میں ہی اُس کی سانس کی آمد و رفت میں افاقہ محسوس ہونے لگا۔ ایک، دو، تین ہفتے گزر گئے۔ پھر تیسویں دن اس کو ایک جھٹکا آیا جو دو گھنٹے میں گزر گیا۔ حملہ اتنا کمزور تھا کہ بعد میں اُسے آرام کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوئی۔ حکیم نے اب اُسے تھوڑا بہت کام دینا شروع کر دیا تھا جو وہ ایک آدھ گھنٹے میں ختم کر لیتا۔ ایک روز حکیم نے اُس سے کہا: "تم نے بہت اچھا کیا جو آ گئے۔ اس علاج میں صبر اور تحمل کی ضرورت ہے۔ کچھ ابتدائی سُوجھ بُوجھ حاصل کر لو تو اور کام بھی سیکھ سکتے ہو۔ تم ان بیتقانوں میں سے نہیں، ان سے زیادہ میل جول رکھنا بھی مناسب نہیں۔ تعلیم یافتہ ہو، میرے پاس جو کچھ ہے اگر چاہو تو مجھ سے حاصل کر سکتے ہو۔ ایک بیٹی ہے، اُسے دسویں درجے تک شہر میں تعلیم دلائی ہے، کچھ گھر میں میری مدد کرتی ہے۔ مگر بیٹی آخر بیٹی ہوتی ہے۔" پھر حکیم نے سرسری لہجے میں کہا کہ وہ اسد کو بالکل گھر کا ایک فرد تصور کرتا ہے، اسے دوا کے برتنوں کو گھر کے اندر لے جانے کی کوئی ممانعت نہیں۔

اب اسے مطب میں اور گھر کے اندر آنے جانے کی آزادی تھی۔ گھر کا کام یاسمین ایک دہقان عورت کی مدد سے چلاتی تھی۔ اسد نے اپنا کھانا بھی حکیم کے گھر سے لینا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ ایک مریض کی حیثیت سے نہیں بلکہ کسی حد تک مالکانہ احساس کے ساتھ مطب کے اندر باہر گھومتا۔ مطب کے کئی چھوٹے موٹے کاموں میں حکیم نے اُس پر انحصار کرنا شروع کر دیا تھا۔ دن میں کسی وقت وہ سفیدے کے درخت تلے اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ کر اپنا دن بھر کا کام دو چار گھنٹے میں ختم کر لیتا۔ زیادہ تر جڑی بوٹیوں کے چھننے پسانے، اور مختلف پسائیوں کے لیے مختلف قسموں کے کھرل اور حمام دستے وغیرہ مہیا کرنے کا کام تھا۔ صرف پسائی کا درجہ متعین کرنے کا کام حکیم نے اپنے پاس رکھا تھا۔ اس بات کا علم صرف اُسی کو تھا کہ کون سی دوا کس حد تک (اور کیوں) کھرل ہوگی، چنانچہ اس سلسلے میں وہ کسی پر بھروسہ نہ کر سکتا تھا۔ اُس روز جب میر حسن نے اسد سے کہا تھا: "ہماری طرف نہیں دیکھتے؟" اسد نے پہلی بار ٹھیک سے اُن کی طرف دیکھا تھا، اور اُن کی نظروں کی ٹکٹکی اور کھرلوں حمام دستوں وغیرہ کے اندر اُن کے ہاتھوں کو اندھے انجان چکروں میں گھومتے ہوئے دیکھ کر اُس نے خوف اور کراہت سے نظریں پھیر لی تھیں۔ خدایا، اُس نے سوچا تھا، لڑکا سچ کہتا ہے۔ یہ لوگ تو بے جان ہیں۔

اب وہ سفیدے کے درخت تلے بیٹھا، دل سے یا میر حسن سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے، مطب کے اُوپر اُوپر کے انتظامات کرتے ہوئے، کبھی کبھی اپنے دل میں حیران ہوتا کہ اس روز اس نے کیا دیکھ کر ان بیچارے لوگوں

کے بارے میں اس طرح خیال کیا تھا۔ آخر یہ عزیب لوگ، دُنیا کے سب لوگوں کی طرح کام کر رہے ہیں اور اس کا معاوضہ اپنی مرضی کے مطابق وصول کرتے ہیں۔ کام میں کیا قباحت ہے۔ جب تک آدمی کام کرنے کے قابل ہے، کام کرتا ہے۔ کام کرنے میں تو کوئی ہتک نہیں۔

★ ★ ★ ★ ★

چنانچہ وہ یاسمین کی خاطر آیا تھا نہ شیر کی خاطر، وہ دوبارہ اس لیے یہاں واپس آیا تھا کہ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ یہاں آکر اب وہ بالآخر خوش تھا۔

"سچ بول رہے ہو؟" یاسمین نے دروازے میں رُک کر پوچھا۔

"ہاں۔" اسد نے کہا۔

یاسمین ایک طویل لحظے تک اُسے دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے اسد کو کندھے پر چھوا، اور دروازہ کھول کر گھر کے اندر داخل ہو گئی۔ اسد اپنے کمرے کو لَوٹ آیا۔ اُس نے بستر سیدھا کیا، اور اُس پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ دروازے کے پاس ایک بندوق ہمیشہ سے دیوار کے ساتھ کھڑی تھی جس کی لبلبی، یہاں سے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر، دبائی جا سکتی تھی۔ ایک دن، اطمینان سے اسد نے سوچا، میں اُٹھوں گا اور دُنیا ہٹ چکی ہوگی۔

(۳)

مسٹر شیر کے شکار کا تھا۔ جینک ایک رائفل شاہ رخ کے پاس تھی، مگر شاہ رخ اس علاقے کا افسر تھا۔ گاؤں کی ایک تہائی آبادی اس کی ماتحتی میں کام کرتی تھی۔ اور اگر وہ کہتا کہ میں تمہاری مہم میں شریک نہیں ہوتا تو کوئی اسے مجبور نہ کر سکتا تھا۔ وہ بس ڈاک بنگلے کے برآمدے میں رات رات بھر رائفل کا سیفٹی کیچ اتارے، بیٹھا رہنے پر مکتفی تھا۔ اس امید پر کہ کسی نہ کسی رات شیر ڈاک بنگلے تک آئے گا۔ اندھیرے میں مشعلوں سی آنکھیں چمکائے گا۔ اور پھر شاہ رخ اپنی محفوظ نشست پر سے اُن آنکھوں کے بیچ نشانہ باندھ کر گولی چلائے گا اور اسے ڈھیر کر دے گا۔ شاہ رخ خوش امید آدمی تھا۔ اسد کبھی سوچتا کہ اصل خوش نظری شاید یہی ہوتی ہے، جو آدمی کو خود پرست، خود فریب اور بااصول منافق بناتی ہے اور اسے بہادرانہ کارنامے انجام دینے کی ہمت عطا کرتی ہے۔ یا جو لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو طویل جھوٹ میں بہم پہنچا کر ان کی زندگیوں کو سہارا دیے رہتی ہے۔ وہ خود بھی، اسد اکثر سوچتا، آخر انہیں میں سے ایک تھا، گو ابھی تک وہ معمولی جھوٹ میں بھی تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا۔ گو یہ ممکن تھا کہ کبھی نہ کبھی مل جائیں۔ اس وقت جب کہ مطب کے احاطے میں بیٹھا وہ لوہے کے حمام میں سلیٹی سے رنگ کے پیچش کے سفوف کو دستے کی مدد سے کبھی دائیں، کبھی بائیں پیس رہا

تھا، اسد نے سوچا کہ عین ممکن ہے کبھی مل ہی جائیں ـــــ چار پانچ سُو بھورے رنگ کی گولیوں کی صورت میں، متواتر کئی مہینوں کی خوراک، چار پانچ سو پانی کے گلاسوں کے ساتھ نگلنے کے لیے، تاکہ اس سانس کا خاتمہ بالخیر ہو اور یہ کبھی لوٹ کر نہ آئے ـــــ اس لیے کہ زندگی گزارنا، اُس نے سوچا، تو کوئی ایسی بات نہیں۔ شاہ رُخ کے بارے میں سوچتے ہُوئے اُس نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو گاؤں کے پانچ بُوڑھے احاطے کو پار کر کے مطب میں داخل ہو رہے تھے، اور اسد کو یاد آیا کہ مسئلہ بندوق کا تھا۔

کیوں کہ گاؤں بھر میں صرف ایک بندوق تھی جو حکیم کے پاس تھی۔ (چند سال پہلے، گڑبڑ کے دنوں میں کئی اور بندوقیں بھی گاؤں میں آئی تھیں، مگر کچھ عرصے کے بعد پولیس نے آ کر وہ اپنے قبضے میں کر لی تھیں۔) حکیم اس بات سے صاف انکاری تھا۔ گاؤں کے یہ بڑے بوڑھے بڑی لمبی عمروں والے آدمی تھے۔ اُن کو وہ دن بھی اچھی طرح یاد تھا جس دن یہ شخص، جو ابھی جوان آدمی تھا مگر عمر سے ڈھلا ہُوا دکھائی دیتا تھا ـــــ جس کے واسطے سے مستقبل میں گنبد کا نام اس گاؤں کی حدود سے نکل کر دُور دُور تک پہنچنا تھا، اور جس نے اپنی باقی عمر ان لوگوں کے درمیان ایک ناقابلِ فہم شخصیت کے طور (خدا کی رحمت، یا زحمت؟) پر گزارنا تھی، ایک مسافر کی شکل میں اپنے شیرخوار بچے کو لیے، ایک سُوٹ کیس اور گول بندھے ہُوئے بستر کے ہمراہ گنبد میں وارد ہُوا تھا، اور یہیں پر رہنے لگا تھا۔ کسی کو پتا نہیں تھا کہ اُس نے مستقل پڑاؤ ڈالنے کے لیے اس گاؤں کا انتخاب کیوں اور کیسے کیا تھا۔ ایک بار اُس نے کسی سے صرف اتنا کہا تھا: "مجھے یہ جگہ پسند آئی ہے۔"

چنانچہ اس بارے میں کئی کہانیاں سُننے میں آنے لگی تھیں جو حکایتیں کچھ ہنگامہ خیز تھیں اپنی طبعی عمر گزار کر مر گئیں۔ جن میں ذرا تخیل کی گنجائش تھی وُہ دہرائی جاتی رہیں، اور بالآخر سکہ بند قصے بن کر لوگوں کی توجہ سے ہٹ گئیں۔ خود وہ آدمی، ان قصوں کے ساتھ ساتھ اور ان سے ذرا ہٹ کر، گاؤں کے سِرے پر، انہی قصوں کی مانند، گاؤں والوں کی قدیم اور گہری زندگیوں سے پَرے پَرے رہتا چلا گیا۔ پہلے پہل کے اُن دنوں میں ان بڑے بوڑھوں نے، جو اُس زمانے میں بھی چالیس چالیس، پچاس پچاس کے پیٹے میں ہوں گے، اپنے کھیتوں میں کام کرتے یا آرام سے بیٹھ کر حقہ پیتے، کھانا کھاتے ہُوئے کئی بار اُسے گاؤں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ گزرتے، خاکی کینوس کے خول میں بندوق کو کندھے سے لٹکائے، سیدھا سامنے دیکھ کر چلتے ہُوئے گاؤں سے نکل کر نیچے وادی میں اُترتے یا چوٹی والے جنگل میں چڑھتے ہُوئے دیکھا تھا۔ پھر کہیں سے ایک تیز دھماکے کی آواز آتی، اور تھوڑی دیر میں وہ ایک مُردہ پرندے کو۔ کسی بھٹ تیتر یا جنگلی کبوتر کو ہاتھ میں لٹکائے واپس آتا دکھائی دیتا۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائے بغیر وہ اپنے گھر کو چلا جاتا۔ پھر گھر کے صحن میں وہ کوئلوں کی آگ پر اُس پرندے کو بھون کر کھاتا۔ اور کبھی کبھی ہوا کے رُخ پر بھُنتے ہُوئے گوشت کی اشتہا آور مہک دُور دُور تک پہنچتی اور ان لوگوں کو اُس شخص کی خود کفالتی کا عجیب، نامانوس سا احساس دلاتی۔ گاؤں والوں کی ہوش میں وہ پہلے فائر تھے جو اُن کے اپنے

گاؤں کے کسی باشندے کی بندوق سے ہوئے تھے۔ یہ جان کر جہاں گاؤں والوں کو فخر کا احساس ہوتا، وہاں اُس شخص کا انجان ماضی، اُس کی بے زن اور بے طلب، بے محنت زندگی، اُس کا روپیہ اُن کو اُس سے دُور دُور رکھتا۔ دہقانی زندگی جس مانوسیت کے دائرے کے اندر بسر ہوتی ہے، اُس زمانے میں وہ شخص، محمد عمر، اُس دائرے کی حدود پہ عجیب پُرخطر طور پہ وقت کاٹتا رہا۔

پھر اچانک بندوق نظروں سے غائب ہو گئی، گو جنگلوں میں اُس شخص کا جانا برقرار رہا۔ اب وہ اکیلا، پہر پہر بھر دُور دُور کے جنگلوں میں گھومنے کے لیے جاتا، جہاں پہ کبھی کسی چرواہے یا گاؤں کو لوٹتے ہوئے کسی مسافر کی نظر اُس پہ پڑ جاتی۔ اکثر وہ زمین پہ نظریں باندھے پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا چل رہا ہوتا، جیسے کسی شے کو ڈھونڈ رہا ہو۔ کبھی کسی درخت یا پودے پہ نظریں لگائے دیر دیر تک کھڑا گھورتا رہتا، یا جھک کر جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی زمین سے کوئی پتا اُٹھاتا، شام کے اندھیرے میں اُسے آنکھوں کے قریب لا کر دیکھتا، اور پھر احتیاط سے تہہ کر کے جیب میں رکھ لیتا۔ ایک روز آخر اُس نے اپنی تین سالہ بچی کو کندھے پہ بٹھایا اور گھر کو دہقان عورت کے سپرد کر کے گاؤں سے رخصت ہوا، یہ کہہ کر کہ وہ تین مہینے تک واپس آ جائے گا۔

وہ دن بھی ان بُڑے بوڑھوں کو یاد تھا جب ٹھیک تین ماہ کے بعد انہوں نے اُسے کرائے کے ایک خچر پہ نیا الومینیم کا ٹرنک لادے، اُس پہ بچی کو بٹھائے گُنند واپس آتے ہوئے دیکھا تھا۔ گاؤں میں آناً فاناً مزید دولت کی افواہیں پھیل گئیں، مگر جب ٹرنک کھلا تو اُس میں سے صرف شیشے کی چھوٹی بڑی، ڈھکنے دار بوتلیں، ٹین کے ڈبے، کچھ بھرے ہوئے کچھ خالی، اور خشک جڑی بوٹیوں کی پوٹلیاں نکلیں۔ اُس روز سے اس شخص نے ایک نئی زندگی کی ابتدا کی تھی، جس نے اُسے محمد عمر سے اُٹھا کر مشہورِ "گمشدہ والا حکیم" بنا دیا اور اُس کی جڑیں اُس خشک زمین میں گاڑنی شروع کر دیں۔

بندوق بہرحال پھر نظر نہ آئی، گو یہ بات کہ اُس گاؤں میں ایک بندوق تھی، جسے گاؤں بھر نے فی الحقیقت چلتے ہوئے سُنا اور مار کرتے ہوئے دیکھا تھا، سب کے علم میں رہی۔ اور اب جب کہ گاؤں کے مویشیوں کو ہی نہیں بلکہ عورتوں اور بچوں کو، چرواہوں اور لکڑہاروں کو ایک خونخوار درندے سے جان کا خطرہ پیدا ہو چکا تھا، سب کی نظریں اِس بندوق پہ لگی تھیں۔ مگر حکیم نے، ایک آدھ ابتدائی اطلاع کے مطابق، بندوق کا مالک ہونے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اب اُس شخص سے، جو کہ ہر روز تازہ دُھلا ہوا سفید کُرتا پہنتا، سر پہ اُسی کپڑے کی سفید، ہلکی سی چوکور ٹوپی رکھتا، اور نہایت مہربانی اور شفقت سے ہر ایک کے ساتھ پیش آتا تھا، اِس بارے میں آخری بات کون کرے۔

اسد سفیدے کے نیچے سے اُٹھ کر چنار کے نیچے جا بیٹھا جہاں سے مطب کے اندر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ اللہ حکیم نے آنے والوں کی خاطر اپنا گدے دار بھگئی ٹانگوں والا تختہ جسے وہ دیوان کے طور پر استعمال کرتا تھا، خالی کر دیا تھا، اور اب اپنی پُرانی آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ پانچوں بوڑھے بے آرامی سے تختے کے ایک ہی طرف کو جمع ہو کر ساتھ ساتھ لگے بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے اپنی پگڑیاں اور ٹوپیاں اُتار کر گھٹنوں پر ٹکا دی تھیں، اور اب بے اعتماد ہاتھوں سے داڑھیاں اور سر کھجا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ماحول کی غیر مانوسیت نے انہیں گنگ کر دیا ہے۔ وہ شاید ایسے نرم گدّے دار تختے پر کبھی نہ بیٹھے تھے۔ اُن میں سے ہر ایک کی یہ کوشش تھی کہ وہ گاؤ تکیے سے دُور از دُور بیٹھے۔ تختے کے سامنے ایک نیچی سی چوکور میز، جو دوائیاں رکھنے یا کبھی کبھار لکھنے کے کام آتی تھی، پڑی تھی۔ اس میز کے مصرف سے بھی اُن کی براہِ راست واقفیت نہ تھی۔ آدھے فرش پر نیلے رنگ کی دری بچھی تھی۔ ایک بوڑھے نے بلا وجہ جھک کر اپنے پیر کے پاس دری کے ایک کونے سے اُلٹے ہاتھ کے ساتھ کچھ گرد صاف کرنا شروع کر دی۔ کونے میں ایک تنگ سی میز پر شیشے کی اونچی چمنی والا بتی لیمپ پڑا تھا۔ دائیں دیوار کے ساتھ وہ چوڑی سی مقفل الماری تھی جس میں حکیم کی اس ساری کرشمہ سازی کا سامان بند تھا۔ کمرے کی ساری چیزیں ایک نہ ایک وقت میں شہر سے لائی گئی تھیں۔ حکیم بید کی بنی ہوئی آرام کرسی پہ ٹیک لگائے ہونٹوں پر بے عنوان سی مسکراہٹ لیے، خاموش بیٹھا خلا میں دیکھ رہا تھا، جیسے یہ سارا ساز و سامان اُس نے فقط اسی دن کے لیے اکٹھا کیا تھا، اور اب اطمینان سے بیٹھا ان لوگوں کی پریشانی کا لطف اُٹھا رہا تھا جو پچیس برس تک اُس کو مشتبہ جانتے رہے تھے اور اب اتنی عمر میں پہلی بار مجموعی طور پر مدد کی درخواست لے کر اس کے پاس آئے تھے۔ اسد کے حمام دستے میں خشک ڈنڈیاں اور پتے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے، اور دیر یہی تھی کہ پیستے پیستے وہ ایک خاص باریکی کے نقطے تک پہنچیں تو تیار ہوں۔ جہاں پہ وہ بیٹھا تھا وہاں سے بخوبی اندر کی گفتگو کو سُن سکتا تھا، مگر گفتگو نادارد تھی۔ چنانچہ وہ چنار کے سائے میں بیٹھا لوہے کے دستے کو مضبوطی سے تھامے، کبھی دائیں کبھی بائیں اُسے حمام میں پھراتا ہوا بدرنگ سی پھکی کو پیسے جا رہا تھا جو پہلے ہی کافی حد تک باریک ہو چکی تھی۔ جہاں تک اُس کا علم تھا، اِس پھکی میں مزید کسی تبدیلی کے آنے کی گنجائش نہ تھی، مگر یہ علم کہ ابھی یہ باریکی کے مطلوبہ درجے تک پہنچی ہے کہ نہیں، اُس کے ہاتھ میں نہ تھا۔ پہلے پہل وہ حیرت سے سوچا کرتا کہ ایک بار جب بھاری دستے کے نیچے کچی پکی ڈنڈیاں اور خشک پتے اور چھوٹے بڑے بیج ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رل مل جائیں، اور کچھ اور پیسنے پر یکجان ہو جائیں، تو پھر اسے بلا وجہ پیستے رہنے سے دوا کی تاثیر میں کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ مگر پھر حکیم نے اُس کو بتایا کہ یہ اُس کے جاننے کی بات نہ تھی، کہ یہ جاننے کی بات تھی ہی نہیں، بلکہ تجربے کی تھی۔ اور تجربے کا بدل وقت کے سوا کوئی نہ تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ بیسیوں، بلکہ سینکڑوں مریضوں پہ اسے پساہٹ کے مختلف درجوں پر آزما کر دیکھا جاتا

ہے اور پھر اُس سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ پھر بھی یہ نتیجہ کبھی کارآمد ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا، جس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کے
حاجتوں کی ہزاروں شکلیں ہیں، اور ہر شکل دُوسری شکل سے مختلف ہے۔ اس کا اندازہ کرنا تجربہ کہلاتا ہے اور یہی اصل علم
ہوتا ہے ——— یہ بھی اُن ہزار ہا ایک طرفہ باتوں کی سی ایک بات تھی جو قریب قریب ہر روز اُسے بتائی جاتی تھیں جن
کا کوئی ثبوت نہیں تھا، اور وہ ان باتوں کو کیے جاتا تھا اس لیے کہ ضروری ہوتی تھیں اور اس ضرورت کا کوئی بدل
نہیں تھا۔ یہ پہلے پہل کی بات تھی جب وہ اُن دُوسروں کو دیکھتا جو اپنا اپنا کام کر رہے ہوتے اور ساتھ ہی ساتھ دل میں
دُعا کیے جاتے کہ ابھی حکیم اپنے حجرے پہ نکلے گا، اُن کے برتنوں میں ہاتھ ڈال کر اُنگلیوں کے بیچ پسائی کو دیکھے گا اور کہے گا
ہو گیا! ہر دم دل میں یہی اُمید لیے کہ اب اُن کی خلاصی ہوئی کہ اب ہوئی، گھنٹوں گھنٹوں تک کیے جا رہے ہیں، کچھ
عادت کے زور پر کچھ علم کی کمی کے احساس سے۔ اُنہیں کہا جاتا تھا کہ کرو، اور فقط یہ کہنا ہی علم کی قوت بن کر اُن کی آنکھوں
پہ پردے کی مانند گر پڑتی تھی اور اُن کے ہاتھوں کو اپنی چاکری میں مصروف کر دیتی تھی کہ علم بہرحال ایک برتر قوت ہے
جو اپنے قوانین رائج کرتی ہے۔ مگر اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہتی جب وہ اپنے ساتھیوں کو اپنے اپنے کاموں پر دھیان
دیے یا بدن کی کوئی قوت صرف کیے بغیر، پہروں پہر خوشی بہ خوشی ہاتھ چلائے جاتے ہوئے دیکھتا۔ وہ کون سی طاقت
ہے، وہ سوچتا، جس کے سہارے پر یہ لوگ کچھ جانے بُوجھے بنا چلے جاتے ہیں؟ پھر کچھ عرصے کے بعد، اُن کے ہاتھوں کی
حرکت کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد، ایک دن اُسے خیال آیا کہ شاید یہ ایک مشینی آہنگ ہے جو ان لوگوں نے پا لیا ہے
جس کے زور پہ یہ اپنے اپنے کام کو اتنی آسانی کے ساتھ نپٹائے جا رہے ہیں۔ ہاتھوں کی حرکات کا اور پسائی کی دھیمی
دھیمی آواز کا فی الواقع ایک آہنگ تھا جو ان کے اِس بے حساب کام کو آسان بنا دیتا تھا۔ اور وقت کے ساتھ، اتنی
صفائی سے انہوں نے اِس ڈھنگ کو اپنا لیا تھا کہ اُن کی علالت کے اِس مقام پہ جہاں نہ علم تھا نہ کوئی اُمید، فقط یہ کام یہ
حرکت ہی اُن کو آرام پہنچانے کا ایک ذریعہ بن گئی تھی، اِس لیے کہ یہ آہنگ جو انہوں نے اپنی انتھک محنت سے
حاصل کیا تھا بالآخر اتنا سیدھا سادا اور آسان اور آرام دہ تھا کہ اِس کے مقابلے میں دُوسری سب باتیں علم یا اُمید یا کچھ
اوٹ پٹانگ سی باتیں لگتی تھیں۔ زندگی کے راستے، اُس نے ایک بار سوچا تھا، کیسی دانائی کے راستے ہیں، اور یہ لوگ ان
راستوں کو کسی نہ کسی طور ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ یہ لوگ شاید دنیا میں حقیقی خالق ہیں۔ اُس نے اس آہنگ کو دریافت
کرنے کی سر توڑ کوشش کی تھی، اور اُسے اعتماد تھا کہ جلد یا بدیر وہ بھی اسے پا لے گا۔

چنانچہ اُس وقت وہ چنار کے نیچے بیٹھا ایسے بے معلوم طریقے پر اپنے بھُورے رنگ کے سفوف کو پیسے جا رہا تھا
کہ ہاتھ روکے بغیر اندر کی باتوں کو سُن سکتا تھا، مگر بہت دیر تک اندر کوئی بات ہی نہ ہوئی، ایسے جیسے دونوں فریق اپنے
اپنے مُوقف پہ اڑے بیٹھے تھے، اور کمرہ آہستہ آہستہ بھاری خاموشی کے طلسم میں جکڑتا جا رہا تھا۔ یہ سکوت اب گھنا ہو

کہ ایک ان دیکھی دُھندکی شکل میں دروازے سے باہر ٹپکنا شروع ہو گیا تھا اور احاطے کے اُس حصے کو اپنی لپیٹ میں لینا جا رہا تھا جہاں اسد بیٹھا تھا۔ اسد کو خیال ہوا جیسے اس سکوت کا اپنا ایک زور تھا جو اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے دلوں پر اپنا خوف طاری کیے جا رہا تھا اور وہ اسے توڑتے ہوئے ڈر رہے تھے، اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے بے چینی سے کسمسا رہے تھے، اور بات کرنے کے ارادے سے مُنہ کھول کر بنا بات کیے اسے بند کر دیتے تھے، کُرتوں کے کُھلے کُھلے بازو چڑھا رہے تھے اور بلا ضرورت کہنیاں کھُجا رہے تھے۔ اسد نے مُنہ پھیر کر دُور دُور تک جنگل میں نظر دوڑائی، اور دفعتہً اُسے درختوں کے ایک جُھنڈ کے بیچ، رات کے اندر یاسمین کا متبسم چہرہ گزرتا ہُوا نظر آیا اور اُس کی آنکھوں میں درد کی ایک ٹیس اُٹھی، جیسے بہُت دیر تک گھُپ اندھیرے میں رہنے کے بعد نظر یکبارگی دھُوپ کے سامنے آجائے۔ اُس نے ایک لحظے کو اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جب اُس نے دوبارہ کمرے کی طرف دیکھا تو اندر بات شروع ہو چکی تھی۔ ایک بوڑھے نے منہ کھولا۔ دو تین بار اُس کے ہونٹوں نے بے آواز لفظوں کی شکلیں بنائیں، اور ابھی اسی کوشش میں تھا کہ دُوسرے نے جلدی سے شُعلے کر بات شروع کر دی۔ بابر اسد کے ہاتھ کی توہیں ٹوٹ گئیں۔ اُس کی انگلیاں دستے کے اُوپر کس گئیں، یہاں تک کہ اُن کے جوڑ سفید ہو گئے، دستہ اچانک جیسے ایک من کا ہو گیا، اور کوشش کے باوجود وہ اپنے من کے آہنگ کو، جو ایسا بے معلوم تھا کہ اُس کی ذات میں معدوم ہو چکا تھا، برقرار نہ رکھ سکا۔ اُس کے کان سنسنا رہے تھے، اور وہ سوچ رہا تھا، یہ مجھے ہوا کیا ہے۔ میں سُن کیوں نہیں سکتا؟ باتوں کے ٹوٹے ہُوئے، چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اُس دُھند میں جیسے سُست رفتاری سے اُڑتے ہُوئے اُس کے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ اتنا اُس نے سُنا کہ وہ بوڑھا دہقان، کسی تمہید کے بغیر، فوراً بر سرِ مطلب آ گیا، اور بولا کہ انہیں بندوق مانگنے کی ضرورت آ پڑی تھی۔ دُوسرے دو بوڑھوں نے بیک وقت بے معنی سی ہوں ہاں کر کے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی، اور پھر حکیم نے پہلی بار مُنہ کھولا اور کہا کہ اُس کے پاس تو اب کوئی بندوق نہ تھی۔ حکیم کی اس بات کے ساتھ ہی جیسے جادو کی چھڑی سے کمرے کے اندر اجنبیت کا وہ طلسم ٹوٹا اور بابر اسد کے جسم کی بے ترتیبی ختم ہو گئی۔ اُس کے کانوں کی سنسناہٹ ایک دم بند ہو گئی اور آنکھوں کی دُھند چھٹ گئی، اور اُس کے ہاتھوں کے دائرے واپس اپنی نہج پہ آ کر اس کے آہنگ کا حصہ بن گئے، جیسے کوئی گاڑی ریل کی پٹڑی سے ایک لحظے کے لیے اُتر جائے اور چند زور شور کے دھچکے کھا کر واپس اپنی پٹڑی کو پکڑ لے۔ سطح کے اندر پانچوں بوڑھے اب بڑے اعتماد کے ساتھ غضبناک ہو رہے تھے۔

"یہ میرے لیے ———" ایک بوڑھے نے اپنی دسوں انگلیاں پھیلا کر اپنے سینے پر رکھیں

"یہ اس کے لیے۔" اُس نے دُوسرے کے سینے پر انگلی لگائی، پھر حکیم کی طرف دیکھتے ہُوئے اُس نے تیسرے کی جانب انگلی لہرائی جو غیر ارادی طور پر تیسرے بڈھے کی داڑھی میں جا گھُسی اور وہ اُس کے وار سے بچنے کے لیے تیزی

سے پیچھے ہٹا "یا اس کے لیے نہیں۔ یہ گشند کے لیے، عورتوں اور جانوروں کی حفاظت کے لیے ہم تمہارے پاس آئے ہیں۔ خطرے کی گھڑی میں تمہیں اپنا جان کر تمہارا ہتھیار مانگنے آئے ہیں۔ آخر گشند تمہارا اپنا گھر ہے . . . . "

پھر حکیم کی میٹھی، کسی حد تک خوفناک آواز: "بیشک۔ بیشک گشند میرا اپنا گھر ہے۔ اس کی حفاظت کی خاطر جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ میرے پاس نہیں۔ بیس پچیس سال ہوئے۔ یہ بات میں نے کسی کو نہیں بتائی، پہاڑ پر یا کسی میں، مجھے اب ٹھیک یاد بھی نہیں کہ کہاں، ایک روز میں نے ایک پرندہ مارا۔ ایسا خوبصورت پرندہ میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ مگر یہ پرندہ حرام تھا۔ اُسے پھینک دینے کے سوا میرے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اُس وقت میں نے سوچا، یہ میں کس کام میں پڑا ہوں؟ آدمی تو جان کی حفاظت کی خاطر پیدا ہوا ہے، میں جان لے رہا ہوں۔ بس خیال کے ساتھ میں ایسا پشیمان ہوا کہ اُسی وقت میں نے بندوق کو گھما کر دُور پھینک دیا۔ ہاں، اب یاد آیا، میں اس وقت پہاڑ کے اوپر کھڑا تھا، مجھے یاد ہے کہ بندوق اتنی دُور نیچے کسی میں جا کر گری تھی کہ مجھے اس کی آواز بھی نہیں آئی تھی۔" حکیم نے افسوس سے سر ہلایا، "کیا پتا تھا کہ ایک روز اس کی ضرورت پڑ جائے گی۔"

تڑے مڑے کاغذ کے سے شکن دار چہروں میں کہنہ آنکھیں بے اعتباری سے بھڑک اُٹھیں۔ پانچوں کے پانچوں بڈھے ایک ایک کر کے اُٹھنے لگے۔

"اچھا صلہ دیا۔" ایک بڑبڑایا، پھر اچانک مڑ کر ایک لمبی الزامیہ اُنگلی حکیم کی آنکھوں کے سامنے ہلا کر اونچی آواز میں بولا: "ہم تمہارے اُوپر اعتبار کر کے آئے تھے حکیم۔ کم سے کم ایک بار زندگی میں یہ ثابت کر دیتے کہ تمہیں ہمارا درد ہے ——" حکیم نے ہاتھ اُٹھا کر کچھ جواب دینے کی کوشش کی، مگر اُس کی بات سُنے بغیر پانچوں بڈھے ایک دوسرے کے پیچھے باہر نکل آئے۔ اُس وقت اسد کی آنکھوں کے آگے اور آنکھوں کے پیچھے دُنیا کا منظر بڑا واضح اور شفاف نظر آ رہا تھا اور اُس کے دل میں مکمل سکوت کا عالم تھا۔ وہ اپنا حمام دستہ وہیں پہ رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ بڑے آرام سے ہلکے پھلکے بدن پر چل کر وہ سفیدے کے نیچے پہنچا۔ یہاں پہ رُک کر اُس نے دھیمی سی نظر احاطے پہ ڈالی۔ دُھوپ کی ایک تیز چادر احاطے کے صحن پر تنی تھی اور گویا نہایت محنت اور صبر کے ساتھ درختوں کے ایک ایک پتے پر منڈھی گئی تھی۔ ان گنوار لوگوں کو، اُس نے سوچا، ان ڈرپوک اور گنوار لوگوں کو کیا حق ہے کہ ہتھیاروں سے مسلح ہو کر ایک شیر کو جان سے ہلاک کر دیں۔ یہ اوہام پرست لوگ اس کے اہل نہیں۔ مطلب کے دروازے پر پانچوں بزرگ لوگ ایک تنگ سے گروہ کی شکل میں رُکے ہوئے تھے اور ایک اُن میں سے پاٹ دار آواز میں چھینکیں مار رہا تھا۔ وہ ایک بار چھینکتا، پھر ناک کے سوراخوں کو اوپر سورج کی سیدھ

ہیں کرکے نتھنے پھلاتا، اور وہاں سے پھر دوسری بدبودار چھینک کا آغاز کرتا۔ چھینکوں کے درمیان وہ زور شور سے ناک سنکے جارہا تھا، جیسے غصّے کے اظہار کا اس سے بہتر طریقہ نہ جانتا ہو۔ پھر وہ پانچوں، اُسی طرح ایک دُوسرے میں گھُس کر چلتے ہوئے احاطے کے دروازے کی جانب بڑھے جس کے باہر گاؤں کے لوگوں کا ایک گروہ اُن کے انتظار میں کھڑا تھا۔ چند لمحوں کے لیے احاطے میں کام کرتے ہوئے لوگوں کے ہاتھ رُک گئے، اور اُن کی آنکھیں احاطے کو پار کرتے ہوئے پانچ شکست خوردہ بزرگوں کا تعاقب کرنے لگیں۔ جب وہ دروازے تک پہنچے تو نظریں اپنی جگہ پر پلٹ آئیں اور ہاتھ پھر سے جاری ہو گئے۔ مگر صرف ایک لحظے کے لیے۔ اُس کے بعد ایک ایسا واقعہ ہوا جو شاید اس احاطے کی عمر میں پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ میر حسن کا تُند جسم ایک سپرنگ کی سی لچک اور قوت سے اُچھل کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ دو تین تیز تیز جھٹکوں کے ساتھ اُس لڑکے نے مطب کو، سامنے دیوار کو، اور پھر دروازے کو دیکھا، پھر ہوا کے پیروں پر اُڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے اُس کا برتن پاؤں کی ٹھوکر سے اُلٹ گیا، لکڑی کا چمچہ دُور جا گرا، اور برتن سے گھنی سی سیاہ معجون (جو ملاوٹ کے بجائے کس مرحلے پر تھی!) آہستہ آہستہ بہنے لگی۔ مگر میر حسن نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا، جیسے اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔

احاطے کے دروازے کی سیدھ میں ایک چوڑی سی گلی جاتی تھی، جو تقریباً تیس گز تک چڑھائی کے رُخ پہ چڑھتی تھی، اُس سے آگے ڈھل جاتی تھی۔ سفیدے کے نیچے سے، جہاں اسد کھڑا تھا، اس مقام پہ گلی سامنے آسمان میں ختم ہوتی ہوئی معلوم دیتی تھی۔ اُس گلی میں اب میر حسن سمیت دس بارہ مردوں کا ایک گروہ، جس کی رہبری پانچ بزرگ کر رہے تھے، اونچائی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ گلی کے دونوں طرف دروازوں میں مرد، عورتیں اور بچے کھڑے ٹکٹکی نظروں سے اُنہیں گزرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ کبھی کوئی عورت یا کوئی مرد اُن کے گزر جانے پر افسوس سے سر ہلاتا۔ کچھ بڑے بچے اور دو مرد گھروں سے نکل کر اُن کے پیچھے ہو لیے۔ اسد کے مُنہ میں ایک بے نام سی بدمزگی پھیلنے لگی۔ وہ اپنے کمرے کو جانے کے لیے دروازے کی طرف چل پڑا۔ اُس مختصر سے گروہ کے لوگ اب گلی کی چوٹی پہ پہنچ چکے تھے اور ایک ایک کر کے نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے تھے۔ یکلخت ایک بوڑھا، جو گروہ کے آخر میں تھا، پلٹا اور ڈھلان پہ اُتر کر غائب ہونے سے پہلے اُس نے مٹھی ہوا میں بلند کی — جو چمکتے ہوئے آسمان کے مقابل کسی جلے ہوئے درخت کی ٹہنی کی مانند اسد کی آنکھوں کے سامنے دیر تک چمچماتی رہی — اور غصّے سے پھٹی ہوئی آواز میں چیخا :

”پناہ گیر !“

اس ایک لفظ میں حکیم کے اور اُن کے درمیان پچیس برس کے بُعد کی وحشت اور ویرانی پھیلی تھی۔ اسد اپنے